

”مگر کیوں اماں؟“

”ارے کبخت! دو چار جماعتیں پڑھ گئی ہے تو دماغ عرش اعظم پر جا پہنچا ہے۔ ارے دانتوں میں انگلیاں داب لیں میں نے تو۔ میری بیٹی ہوتی تو خنیا سے پکڑ کر چار لگاتی، مگر ان کی ماں بڑی مسکینی سی مسکرا کر کہتی ہیں کہ بہن ہم تو راضی تھے، لیکن عرشی نہیں مانتی کہتی ہے لڑکے کی جاب اسے پسند نہیں۔ میں نے بھی صاف کہہ دیا کہ بی بی ابھی کم عمر ہو تو یہ چٹکے چٹکے سوچھ رہے ہیں، تمہیں گل کو ان ہی بالوں میں جب چاندی چمکے گی تو کلرک تو کیا، چپڑاسی پر بھی راضی ہو جاؤ گی۔“

”چھوڑو اماں!“ ان کا دل ٹوٹ گیا تھا۔

”ان کی مرضی وہ جیسا برچاہیں، تم نے کیوں ایسا بڑا بول بولا۔“

”لو بھلا۔“ انہوں نے حیرت کا اظہار کیا۔ ”کیا میں ڈرتی ہوں کسی سے؟ میاں لگی لپٹی رکھنا ہم نہ جانیں، جو دل میں آیا سو کہہ ڈالا۔ وہ ہمارے منہ پر ایسا جوتے کا سا انکار کھینچ ماہریں اور ہم چپ چاپ لوٹ آئیں؟ تم لکھ لو، کل کو یہی عرشی بی بی کفِ افسوس ملیں گی کہ

اماں نہ جانے کون سی مرتبہ، کتنے ہزارویں مرتبہ ناکام و نامراد لوٹیں۔ شکیل احمد کو ان کی ناکامیوں کی تعداد بھی یاد نہ رہی تھی۔ شام سے وہ کتنی آس سے کتنے ارمانوں سے۔ دھڑکتے دل کے ساتھ ان کا انتظار کر رہے تھے، لیکن اماں کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی ان کی آس کا جنازہ اٹھ گیا تھا۔ ارمانوں کا خون ہو گیا تھا اور دھڑکن تھوڑی دیر کے لیے سست ہو گئی تھی۔

”کیا رہا اماں؟“ جب اماں بڑا سا پان منہ میں رکھ کر پائیدان کوٹنے میں سرکا کر فراغت سے بیٹھیں تو انہوں نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔

”دھول خاک۔“ انہوں نے پیک اگلا ان میں اینڈیلی اور ہونٹوں کے کنارے انگلیوں سے پونچھے۔

”ارے بیٹا! شرافت اٹھ گئی ہے دنیا سے۔ قرب قیامت کے آثار ہیں سب۔“

”پر اماں! ہوا کیا ہے؟“ انہوں نے اصرار کیا۔

”وہ ڈھائی کلو کا مٹھائی کا ڈبّا!“

”ارے کل موووں نے وہ بھی رکھ لیا دھڑلے سے اور لڑکی نے انکار بھی کر دیا صاف صاف۔“

”لڑکی نے انکار کر دیا؟“ ان کے دل کو دوچکا لگا۔

نوافلطی



ہائے قسمت کیوں ایسا چاند سا برٹھکرا دیا؟“  
 شکیل احمد اپنی تعریف پر ذرا سا شرمائے اور اٹھ کر  
 باہر آ گئے۔

”ہاں تو میاں شکیل احمد! اب وقت کی چال بدل گئی  
 ہے۔“ انہوں نے رات کو اپنے بستر پر لیٹ کر سوچا۔  
 ”کل تک ملنے والا ہر رشتہ اماں کی ٹھکراتی رہیں۔  
 ہر لڑکی میں انہیں سو سو عیب نظر آتے رہے اور اب یہ  
 حال ہے کہ لڑکیاں خود ان کے رشتے پر انکار کر دیتی ہیں۔“  
 انہوں نے اداسی سے چھت پر گھومتے ہوئے پچھلے  
 کو دیکھا۔

دس برس بیت گئے، پر اماں کو اپنی پسند کی ہونہ مل  
 سکی۔ پچیس برس کے تھے شکیل احمد جب ان کی نئی نئی  
 نوکری لگنے پر اماں کی خوشی سے پھولے نہ سما کر کہتی  
 تھیں کہ اب اس آگن میں چاند سی ہوا ترے گی اور  
 جب سے انتظار کر کر کے شکیل احمد کے تمام ارمان سو  
 گئے، تمام جذبات باسی ہو گئے، مگر اماں کو ان کی چاند سی  
 ہو اس روئے زمین پر کہیں بھی دستیاب نہ ہو سکی۔  
 ”آخر ایک واحد لڑکی میں۔۔۔ کتنی خوبیاں یکجا ہو سکتی  
 ہیں۔“ انہوں نے تاسف سے سوچا۔

”خوب صورت بھی ہو اور خوب سیرت بھی، پڑھی  
 لکھی بھی ہو، ماہر امور خانہ داری بھی ہو، ہاتھ ہر وقت  
 چلتے رہیں، زبان ہمہ وقت تھمی رہے، تھکان سے دور کا  
 واسطہ نہ ہو، البتہ مسکان قریبی رشتہ دار ہو، ہر وقت  
 ہونٹوں پر ڈھٹائی سے جھی رہے، چاہے اماں باتیں  
 سنائیں یا طعنوں سے جگر پھلانی کر سں۔ صبر و  
 استقامت کا مجسمہ ہو، متانت و بردباری بھی بدرجہ اتم  
 موجود ہو، اب۔۔۔ قائد اعظم جیسی ہمہ گیر خصوصیات  
 کی حامل شخصیت تو صدیوں میں کہیں ایک پیدا ہوتی  
 ہے، مگر اماں کو یہ کون سمجھائے اور یوں اس کو ہر نایاب  
 کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہوئے اماں کو ایک

طویل عرصہ (دس سال کا) گزر گیا تھا اور شکیل احمد  
 کنوارے کے کنوارے تھے۔ افتخار اسکول کے زمانے  
 سے ان کا کلاس فیلو تھا۔ لی اے یاس کر کے دونوں نے

ایک ساتھ اپنی جاب کا آغاز کیا تھا اور افتخار کو اب پانچ  
 عدد بچوں کا باپ ہونے کا افتخار حاصل تھا اور شکیل احمد  
 اپنی قسمت پر شاکر و صابر تھے۔ ہاں کبھی جو بھولے بھٹکے  
 افتخار کے گھر ملنے چلے جاتے تو مہینوں خود سے شرمندہ  
 رہتے۔ افتخار کی زوجہ محترمہ کو دیکھ کر ان کی آنکھوں  
 میں نمی اتر آتی تھی اور اس کے پانچ بچوں کو یکے بعد  
 دیگرے پانچ پانچ روپے تھماتے ہوئے ایک حسرت سی  
 انگڑائی لیتی تھی۔

”کاش! یہ روپے میں اپنے ذاتی بچوں پر خرچ  
 کرتا۔“ کثروہ سوچتے۔

افتخار جب اپنی بیوی کو حمیدہ کے بجائے پیار سے  
 حمی پکارتا تو وہ بھی اپنی بیوی (ہونے والی) کے لیے کوئی  
 اچھا سا پیار بھرا نام سوچتے۔

”اگر اس کا نام عالیہ ہو، تو عالی کہوں گا، شہانہ ہو تو  
 شہی، نعیمہ ہو تو نمی!“ وہ دل ہی دل میں کئی ارادے  
 باندھتے۔ اماں اگر کہیں۔۔۔ جانے لگتیں اور شکیل احمد  
 کو لڑکی کا نام بھی بتا جاتیں، تو ان کے وارے نیارے ہو  
 جاتے۔

”ہوں! تو محترمہ کا نام منیرہ ہے! پھر میں کیا کہوں گا  
 اسے؟“ اماں کے جانے کے بعد وہ مسرور سے، ستون  
 سے ٹیک لگا کر سوچتے رہتے۔

”منیری! نہیں، بھئی رست ماڈرن ہو جائے گا۔ پھر منی!  
 ادب! ہوں! لا حول ولا قوۃ! بیوی کو منی پکارنا انتہائی غیر  
 روحانی فعل ہے، روٹی؟ نہیں، نہیں، دوست سمجھیں  
 گے کہ ان کی بھالی کی شکل ہی روٹی ہے۔ روٹی۔! ہاں  
 بالکل ٹھیک، بڑا ہی پیارا نام ہے۔“ پھر جب تک اماں  
 لوٹیں وہ روٹی، روٹی کی تسبیح کرتے رہتے۔

”نہ ناک نہ آنکھ۔“ اماں کا تند و تیز لہجہ ان کا کلیجہ  
 اندر تک چیر جاتا۔

”ارے بھئی ذرا تو نمک ہو چہرے پر، مجھے تو ایک  
 آنکھ نہ بھائی۔“

اور شکیل احمد ٹھنڈی سانس بھر کر رہ جاتے۔  
 پھر نہ جانے کتنی آن دیکھی لڑکیوں کے انہوں نے



کتنے نام سوچے۔ عائشہ کے لیے عائشہ، فگمت کے لیے فگمت، گنگی مدحت کے لیے مدحو، فرحانہ کے لیے فری، نعمانہ کے لیے لغنی! اور اماں کے بعد دیگرے سب کو رہجھکٹ کرنی رہیں۔ کسی کارنگ ضرورت سے زیادہ سناؤلاتھا، کسی کی زبان بہت چلتی تھی، کسی کے پیر میں نقص تھا تو کسی کی آنکھ میں، کسی کے چہرے پر تکیوں کی بہتات تھی، بقول اماں کے ”ارے وہ لڑکی تھی کہ تلوں کا لڈو!“

اور شکیل احمد، اماں کے ان بڑے بولوں پر کڑھ کر رہ جاتے، آفس جاتے ہوئے راستے میں گزرتی لڑکیوں کا وہ بغور معائنہ کرتے تھے انہیں تو کبھی کوئی لڑکی بری نہ لگی تھی، چاہے وہ سانولی سلونی ہو یا گوری بھوکا، موٹی ہو یا دلی چہرے، تل ہوں یا مہاسے، لڑکی تو لڑکی ہوتی ہے، لطافت و نزاکت کا مجموعہ، یہ ہنستی، مسکراتی، کم کم کھلاتی لڑکیاں بھلا کسی کو بری لگ سکتی ہیں۔ شکیل احمد دل کے بہت اچھے تھے، نرم و نازک جذبات و احساسات کے مالک، شاعرانہ خیالات رکھنے والے۔ انہیں تو کسی میں کوئی خامی، بمشکل ہی نظر آتی تھی، بلکہ اچھی خاصی، موٹی تازی خامی کو بھی وہ نظر نظر انداز کر سکتے تھے۔ مثلاً ”نعمانہ کے لیے جب اماں رشتہ لے کر گئی تھیں تو واپس آکر انہوں نے بتایا تھا کہ لڑکی کی دائیں ٹانگ میں نقص ہے، اس پر وہ انکار کر آئی ہیں۔ شکیل احمد کا نرم و نازک دل اس بات پر بہت دیر تلک افسردہ رہا تھا۔

”اماں بھی کمال کرتی ہیں۔ یعنی اتنی سی بات پر انکار کر دیا۔ یہ نقص بھی کوئی نقص ہے۔ بے چاری تھوڑا سا لنگڑاتی ہی تو ہوگی۔ اس میں کیا ایسی بڑی بات تھی۔ یہ اماں بھی کبھی کبھی زیادتی کر جاتی ہیں۔ کتنا افسردہ ہوئی ہوگی بے چاری لغنی!“ وہ دونوں اس بات پر ملول پھرا کیے تھے۔

\*\*\*

یوں دن پر دن بیتتے چلے گئے۔ اماں لڑکیاں دیکھتی رہیں، دیکھتی رہیں اور دیکھتی ہی رہیں۔ ان کے مابعد ار اور فرمانبردار بیٹے نے بھی زبان کھول کر نہ دی۔

”اماں جان! کیا مجھے برہائے میں دو لہا بناؤ گی؟ چاند سی بہو نہیں ملتی نہ سہی، تمہارے کونوں والا کوئی چھوٹا موٹا تارہ ہی لے آؤ۔“

آج بھی جب اماں، عرشہ کو فائل کرنے گئی تھیں تو شکیل احمد نے کیا کیا خواب نہ سجائے تھے۔ اکیلے گھر میں انہوں نے کیا کیا ڈانٹا لگ نہ بولے تھے۔

”عرشی! ذرا اچھی سی چائے تو بناؤ۔“

”عرشی چندا! کیوں رو رہی ہو؟ اماں نے کچھ کہہ دیا ہے؟ ارے یار! تمہیں پتا تو ہے اماں کا! زبان کی کڑوی سہی، دل کی بہت اچھی ہیں۔ کتنے چاؤ سے تمہیں دلہن بنا کر لائی ہیں۔ تمہارا برا تھوڑا ہی سوچیں گی۔ چلو اب ہنس دو۔۔۔ ہنس دو، بھئی، دیکھو ہنس دو، ورنہ میں بھی رو دوں گا اور جب اماں نے آکر عرشی چندا کا جواب سنایا تو واقعی ان کا دل روئے کو چاہنے لگا۔ لیکن قدرت نے جب اماں ایسی دی تھی تو لازمی طور پر صبر و ضبط کا بے تحاشا مادہ بھی عطا کیا تھا کہ ”توازن“ تو قانون قدرت ہے۔ سو انہوں نے ہمیشہ کی طرح زبان پر چپ کے پیرے بٹھائے، اشکوں کو واپس حلق سے اٹار اور تکیے لے کر اپنے بستر بریٹ گئے اور آنکھیں موند کر افتخار کی خوش قسمتی پر رشک کرتے کرتے جانے کب سو گئے۔

\*\*\*

”ہاں بھائی شکیل! پھر کب مٹھائی کھلا رہے ہو؟“ افتخار بھی اماں کی طرح چان کا شوقین تھا۔ ہمیشہ منہ میں پیک بھر کر بات کا آغاز کرتا تھا۔

”کس بات کی؟“ شکیل احمد نے سادگی سے پوچھا۔ ”مٹھائی و گٹنی کی۔ تم بتا رہے تھے ناکہ کہیں رشتے کی بات چلائی ہے اماں نے۔“ افتخار نے پیک پھینک کر رومال سے منہ صاف کیا۔

”کوئی نئی بات ہے بھلا؟“ اندر سے آتی ہوئی حمیدہ نے طنز سے کہا۔ یا شاید شکیل احمد کو ہی ایسا محسوس ہوا۔

”ان کے رشتے کی بات تو کوئی ہزار مرتبہ چلائی ہوگی ان کی اماں نے، پھر خود ہی ختم کر دی ہوگی۔“ اس نے



سموسوں کی پلیٹ میز پر رکھی۔  
 ”اب اس لڑکی میں کیا نقص تھا؟“  
 ”لڑکی میں نقص نہیں تھا۔“ انہوں نے شرمندگی سے سر جھکایا۔  
 ”اماں کو پسند بھی آگئی تھی مگر اس نے خود ہی انکار کر دیا۔“

”لڑکی نے؟“ حمیدہ نے حیرت سے آنکھیں پھیلایں اور شاید مسکراہٹ دکھائی۔  
 ”مگر کیوں؟“

”اے شاید میری نوکری پسند نہیں ہے۔“ انہوں نے سموسہ اٹھا کر خفت چھپائی۔  
 ”ہاں بھئی، جیسے کو تیسرا!“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور افتخار نے کھنکار کر اسے متنبہ کیا۔

”آج کل کی لڑکوں کے بھی تو ہزار خرے ہیں کوئی ایک دو نہیں۔ شکل و صورت کی ذرا اچھی ہوں تو کلر کی کوٹھیکے براڑا آتی ہیں۔“ اس نے افتخار کی کھنکار کو ٹھیکے پر اڑا کر عملی ثبوت پیش کر دیا۔

”حمی جان! چائے بھی لے کر آؤ صرف سموسوں سے کام نہیں چلے گا۔“ مجبوراً افتخار نے اسے منظر سے غائب کروینے کی ترکیب سوچی۔  
 ”جی لاتی ہوں۔“ وہ انھی۔

”مجھے تو بے چارے کھلیل بھائی پر ترس آتا ہے۔“  
 ”جی۔۔۔ جی۔۔۔ جی۔۔۔“  
 وہ انتہائی دل رنج و غم کا مظاہرہ کرتی کچن کی طرف لوٹ گئی۔

”یار کھلیل! اس بے وقوف عورت کی بات کا برا نہ ماننا۔“ افتخار حمیدہ کی موجودگی میں ”حمی جان“ اور غیر موجودگی میں ”بے وقوف عورت“ کے القاب استعمال کرتا تھا۔

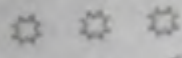
”نہیں، نہیں۔“ کھلیل احمد ہمیشہ کے ساتھ دل۔  
 ”اس میں بھلا برا ماننے کی کیا بات ہے بھابھی بالکل درست کہتی ہیں۔“

”میں حمیدہ سے کہوں گا کہ تمہارے لیے کوئی بہت ہی اچھی لڑکی ڈھونڈے۔“ اس کے رخصت ہوتے

سے افتخار نے برسوں۔ پرانی بات دہرائی۔ پچھلے آٹھ سالوں سے، جب سے اس کی شادی ہوئی تھی۔ کھلیل احمد سے چھڑنے وقت وہ انہیں ہمیشہ انہی الفاظ میں تسلی دیتا تھا اور اب کھلیل احمد کو اس ”الوداعیہ ہنٹے“ کی بخوبی پر یکیش ہو چکی تھی۔

”اچھا خدا حافظ!“ ان کا دل کچھ زیادہ ہی دکھی تھا۔ جب ہی انہوں نے ہمیشہ کی طرح ”بہت مسکرائی ہوئی ہاں۔ بس بھلائی جیسی ہو۔“ کے بجائے صرف خدا حافظ کہنے پر اکتفا کیا۔

”خدا حافظ!“ افتخار تاسف سے دیر تک ان کو جاتے دیکھتا رہا۔



اماں دوپہر سے کسی عزیز کے ہاں تعزیت کے لیے گئی ہوئی تھیں اور کھلیل احمد آنگن میں چارپائی پر لیٹے اپنے بد قسمتی پر غور فرما رہے تھے۔  
 ”کتنا بے نور ہے یہ آنگن!“ انہوں نے اطراف میں نگاہ گھمائی۔

”ہرموں سے ایسا ہی اجاڑ۔ کتنا بد رنگ لگتا، یہی آنگن جو کوئی سر شام سے ہی پانی چھڑک کر ٹھنڈک بکھیر دیتا۔ یہ چند کچلے جنسیں اماں برسوں میں کہیں جا کر تیار کیا کپڑائی کی چند بوندوں سے نوازا آتی ہیں۔ کتنے کچلے کھلے رہتے۔ روز پانی جو ملتا انہیں، یہ پودے اتنے لمبے ہوئے کہ آٹھ افسردہ تو نہ لگتے۔ یہ شام کا ساہا وقت جب ہر سمت چائے کی خوشبو پھیلی ہوئی چائے، اتنا کٹ کھانے کو تو نہ دوڑتا۔ پورچی خانے سے قسم قسم کے کھانوں کی منک۔ آئی۔ کبھی بریانی، کبھی کوٹھے، کبھی دال بھی سسی۔ جب وہ روٹیاں نکلتی تو چوڑیوں کی چھن چھن چھتا چھن میں یہاں آنگن میں بیٹھ کر سنتا اور گھنٹوں سر دھناتا۔ یہ بے نور کچلے، عموماً جو خالی رہتے ہیں۔ لبالب پانی سے بھرے رہتے اور وہ ان سے بھرے لیٹ دیا کرتی تو بے جان منکوں میں بھی جیسے جان پڑ جاتی۔ ولوری قسمت!“ انہوں نے گہرا سانس لیا اور آسمان پر نمودار ہوتے ہوئے تاروں کو دیکھتے اور

گنتے رہے۔  
 ”چند اتوری چاندنی میں جیا جلا جائے رہے۔“ ابھی  
 انہوں نے اپنی بے سری آواز کا جادو جگانا شروع ہی کیا  
 تھا کہ فرشتے گھبرا کر دوڑے اور کسی شخصیت کو پکڑ  
 لائے جس نے دروازہ بجایا اور شکیل احمد مزید گانے کی  
 خواہش دل میں دبا کر اٹھ گئے۔

”کمال کر دیا اماں! اتنی دیر۔۔۔!“ ان کے الفاظ منہ  
 میں ہی رہ گئے۔ دروازے پر تو کوئی اور خاتون کھڑی  
 تھیں۔

”السلام علیکم!“ انہوں نے گھبرا کر سلام داغا۔  
 ”وعلیکم السلام، جیتے رہو۔“ خاتون نے مسکرا کر سر  
 سے پاؤں تک ان کا جائزہ لیا۔  
 ”سعیدہ کے بیٹے ہونا؟“  
 ”جی ہاں۔“ انہوں نے موڈ بن کر ان کو راستہ

دیا۔

”تشریف لائے۔“  
 ”سعیدہ ہے نا گھر پر؟“ اندر آ کر بیٹھتے ہوئے انہوں  
 نے پوچھا۔

”جی، آپ کو کچھ دیر انتظار کی زحمت اٹھانی پڑے گی۔“  
 وہ فرمانبرداری سے بولے۔  
 ”اماں کسی عزیز کے ہاں گئی ہیں۔ بس آتی ہی ہوں  
 گی۔ پانی لاؤں آپ کے لیے؟“ ان کا پھولا ہوا سانس  
 دیکھ کر انہیں خیال آیا۔  
 ”ہاں بیٹا! تکلیف کرنا۔“

”تکلیف کی کیا بات ہے خالہ!“ وہ جھٹ اٹھے اور  
 پانی کا گلاس لے آئے۔

”جیتے رہو۔“ پانی پی کر انہوں نے چشمے کی اوٹ  
 سے پھر ان کا جائزہ لیا۔

”پہچانتے ہو مجھے؟“

”نہیں خالہ!“ وہ مسکرائے۔

”پہلی بار دیکھا ہے۔“

”ہاں تمہیں بھلا کہاں یاد ہو گا۔“ انہوں نے تکیے  
 سے ٹیک لگائی۔

”پانچ برس کے تھے، جب میں بیاہ کر چلی گئی تھی۔“



”ارے فکیل احمد! ادھر آؤ دیکھو ڈراکون آیا ہے۔  
وہ انہیں پکار رہی تھیں۔ وہ ہار نکلتے۔  
”جی اماں! مل چکا ہوں میں بڑی خوشی ہوئی مل کر۔“

”ارے سعیدہ! بے کار عورت ابھی تک تجھ سے  
ایک بہو کا انتظام نہ ہو سکا۔“ وہ واپس کچن کی طرف آ  
رہے تھے جب انہوں نے سنا۔

”ہائے بتول! کیا بتاؤں کہنے کو تو لڑکیاں ڈھیروں کی  
ماری میسر ہیں لیکن ڈھونڈنے نکل تو لگتا ہے کہ کال پڑ  
گیا ہے اور پھر۔ اب فکیل کی عمر بھی تو کافی نکل گئی  
ہے۔“

انہوں نے آواز دھیمی کی پھر بھی چند جملے انہوں  
نے سن ہی لیے کہ دم سادھے کان لگائے بیٹھے ہوئے  
بھی تو تھے۔

”تمہیں رشتے پسند آئے مجھے، بر انہوں نے ہی  
صاف انکار کر دیا۔ کسی کو عمر پر اعتراض تھا تو کسی کو  
نوکری پر۔ حالانکہ کافی معقول منخواہ ہے میرے فکیل  
کی عمر یہ آج کل کی چھو کر یاں۔ ارے بھیا! آفت  
ہیں آفت! انہوں نے غالباً ”کان پکڑے۔“

”اب تو میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ جیسے تمہیں  
تمہاروں یہ قضیہ ”میرا کیا بھروسا“ آج مر جاؤں تو بیٹا تو  
کو سے گانا زندگی بھر۔“

”ارے کیاں بد فائلیں نکالتی ہو۔ خدا تمہیں لمبی عمر  
دے پوتے پر پوتے دکھائے۔“

فکیل احمد نے ان کے درمیان چائے رکھی اور اس  
بات پر کچھ سرخ ہوئے۔

”ارے فکیل! بس چائے پر ٹرکلو گے اپنی خالہ کو؟  
اماں نے مصنوعی خطی اور حیرت سے انہیں دیکھا۔  
”کچھ بسکٹ پیسٹری نہ لائی گئی تم سے؟ دو قدم پر  
بیکری کھڑی ہے؟“

”اماں! میں نے سوچا کہ کھانے کا وقت ہو چلا ہے تو  
میں خالہ کے لیے کھانا ہی لے آتا ہوں۔ نصیر بیانی والا  
ابھی کھڑا ہی ہو گا۔“ انہوں نے گھڑی دیکھی۔

”نہ بیٹا! یہ کھانے کا تکلف نہ کرنا۔“ خالہ بتول

سعیدہ سے چھوٹی بھی ہوں ناچھ سات برس۔“ درمیان  
میں ٹرک کر انہوں نے ایک اہم اطلاع انہیں فراہم  
کی۔

”کچھ عرصہ خط و کتابت کا رابطہ رہا پھر دونوں الجھ کر  
رہ گئے اپنے اپنے گھر پار میں۔ کوئی تیس برس کے بعد  
ملوں گی سعیدہ سے، کوئی اور نظر نہیں آ رہا۔“ انہوں  
نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔

”اور کون ہو گا خالہ؟“ وہ حیران ہوئے۔

”بس میں اور اماں ہی تو رہتے ہیں۔ ابامیاں کا  
طویل عرصہ ہوا انتقال ہو گیا۔“

”ہاں ہاں وہ تو جانتی ہوں میں۔ میرا مطلب ہے کہ  
کیا شادی نہیں ہوئی تمہاری؟“

”جی نہیں۔“ وہ کچھ شرمائے، کچھ شرمندہ ہوئے۔

”اچھا!“ انہیں بے حد حیرت ہوئی۔  
”ابھی تک۔!“

وہ منہ میں کچھ بڑبڑائیں اور فکیل احمد صرف ابھی  
تک ہی سن سکے اور حتی المقدور زمین میں گر گئے۔

”آپ بیٹھیں، میں چائے بناتا ہوں۔“ وہ اٹھ کر  
کچن کی طرف جانے لگے۔

”رہنے دو بیٹا! مرد ذات ہو، کہاں الجھتے پھو گے ان  
دھندوں میں۔“

”ارے خالہ! مجھے یہ سارے دھندے آتے ہیں۔“  
رہنے۔

”کبھی اماں بیمار ہو جاتی ہیں تو میں کھانا تک پکا لیتا  
ہوں۔“

”ماشاء اللہ بڑے ہی سعادت مند اور نیک سیرت  
ہو۔“ وہ جی بھر کر خوش ہو میں۔

”کہاں ہوتے ہیں آج کل کے زمانے میں ایسے مرو  
لڑکے؟“ انہوں نے زبان کو پھسل جانے کے بعد قابو  
کرنے کی کوشش کی۔

فکیل احمد زخموں کو سینکتے ہوئے باورچی خانے میں  
آکر چائے بنانے لگے۔ اسی دوران انہوں نے باہر اماں

کی آواز بھی سن لی۔ وہ برسوں بعد ملنے والی سہیلی سے  
لیٹ کر غالباً ”دور رہی تھیں۔“

نے معذرت برے ڈھیلے لہجے میں کی۔

”میں بس اب چلوں گی چائے پی کر۔“

”ارے بتول! غضب خدا کا یوں شرمندہ کرو گی مجھے! یوں کھائے پیے بغیر تو ہر گز لوٹ کر نہ جانے دوں گی، اماں کو غصہ آنے لگا۔“

”قسم سے سعدہ! بالکل موڈ نہیں کھانے کا اور پھر نہ بھانہ بھی اکیلی ہوگی۔“

”نہ بھانہ کون؟ تمہاری بیٹی؟“

”ہاں! ہاں! ایک ہی تو بیٹی دی ہے خدا نے۔“ وہ مسکرائیں۔

”اے دیکھ دیکھ کر جیتی ہوں بس میں۔“

”تمہاری بیٹی تو۔“ اماں نے دل میں کچھ حساب لگایا۔

”شادی نہیں کی ابھی؟“

”بس بہن کیا بتاؤں۔“ انہوں نے بھی ایک

ٹھنڈی آہ بھر کر اپنی داستان الم شروع کی۔

”ارے شکیل! یہاں کیا سر پر کھڑے ہو عورتوں کے؟ جاؤ بریانی لے آؤ دوڑ کر۔ بتول کو میں کھانا کھائے بغیر ہر گز نہ جانے دوں گی۔“

اماں نے بتول کی اسٹوری سننے کا موقع شکیل احمد کو نہ دیا اور وہ بتول خالہ کی نیم رضامندی یعنی خاموشی دیکھ کر بریانی لینے چل دیے۔

نصیر بریانی فروش نے جو شکل سے برہہ فروش کے علاوہ ضمیر فروش بھی لگتا تھا۔ کمال صفائی سے انہیں بغیر بوٹیوں کے بریانی دینی چاہی، جس پر انہوں نے خفا ہو کر دوسرے پھیلے کا رخ کیا اور فرانی مچھلی اور نان لے کر گھر لوٹے اور دونوں خواتین کو خاصا خوش و خرم پایا۔

”بھئی بتول! بوجھ ہلکا کر ڈالا تم نے میرے دل کا!“

بتول خالہ رخصت ہونے لگیں تو اماں نے انہیں گلے سے لگا کر کہا۔

”قسم سے دل لگتی کہتی ہوں، دوستانے کا حق ادا کر دیا۔“

”سعدہ! شکر گزار تو میں تمہاری ہوں، بوجھ تو میرا

ہلکا ہوا ہے۔“ بتول خالہ نے شکیل احمد کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

ان کے جانے کے بعد وہ بڑی دیر تک ان الفاظ میں الجھتے رہے۔

”شکیل میاں!“

\*\*\*

دوسرے دن وہ آفس سے آکر کھانا کھا رہے تھے جب اماں نے بات کا آغاز کیا۔

”جی اماں! کیسے!“

”بیٹا! میں چاہتی ہوں کہ اس اہم فریضے سے سبکدوش ہو جاؤں۔“ اماں اس طرح ادا اس ہو کر بولیں جیسے ان کی وداعی کی بات کر رہی ہوں اور شکیل احمد! ان کا دل یکبارگی پھر اسی طرح دھڑکنے لگا جیسے پچھلے دس برس سے اس ذکر پر دھڑکتا آ رہا تھا۔

”کون سا فریضہ اماں؟“ لا تعلقی کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے ٹماٹر کا ٹکڑا منہ میں رکھا۔

”یہی تمہاری شادی کا۔“ اماں جانے کیوں ادا اس سی لگتی تھیں۔

شکیل احمد خاموشی سے پانی پینے لگے۔

”کل بتول آئی تھی ناں!“

”جی، آئی تھیں۔“

”اس کی ایک بیٹی ہے نہ بھانہ۔“

”نہ بھانہ!“ وہ دل میں سوچنے لگے۔

”جنتا۔ یا ہنی۔ ہاں ہنی مناسب رہے گا۔“

”کیا سوچ رہے ہو بیٹا؟“ اماں اس نام پر انہیں غلطاب و بیچان دیکھ کر کہنے لگیں۔

”جی!“ وہ چونکے۔ ”کچھ نہیں اماں! یوں ہی آفس کی ایک بات یاد آگئی۔“

”لو سن لو۔“ وہ خفا ہوئیں۔

”میں اتنے اہم مسئلے پر بول رہی ہوں اور تم ابھی تک اپنے آفس کے دھندوں میں الجھے ہو۔“

”نہیں اماں! آپ بولیں، میں ہمہ تن گوش ہوں۔“

”ہاں تو میں کہہ ہی رہی تھی کہ بتول کی ایک بیٹی ہے نہ بھانہ۔“ مٹکنی ہوئی تھی اس کی چھ سال پہلے پھر



ٹوٹ گئی۔ تب سے بے چاری کا کوئی ڈھنگ کا رشتہ ہی نہ آیا۔  
 ”جی! اماں خاموش ہوئیں تو مجبوراً انہیں کسنا پڑا۔“  
 اپنے کمرے میں آکر خوشی سے پھولے نہ سہاتے  
 ہوئے انہوں نے دروازہ بند کیا اور بستر پر بیٹھ کر تصویر  
 نکالی خوشی چند لمحوں کو ماند پڑی، پھر وہ زبردستی  
 مسکرائے۔

”کل بتول کو تم بہت پسند آئے۔ اس نے بات کی  
 کہ تمہاری اور رحمانہ کی جوڑی مناسب رہے گی۔“  
 ”جیسے آپ کی مرضی اماں!“ ان کا دل بلیوں اچھلنے  
 لگا تھا۔

”میں آج گئی تو بھی بتول کے ہاں اسے دیکھنے کے  
 لیے۔“ اماں نے کچھ تامل کے ساتھ کہا۔

”مجھے تو مناسب ہی لگی۔ بیٹا! حسن سب کچھ تو  
 نہیں ہوتا نا!“

”میں تو کب سے یہی کہہ رہا ہوں اماں!“ انہوں  
 نے سوچا۔ ”آپ کی ہی ضد تھی۔“

”لڑکی پڑھی لکھی بہت ہے۔“ انہیں سوچنا دیکھ کر  
 اماں جلدی سے بولیں۔

”ماشاء اللہ یونیورسٹی میں پڑھی ہوئی ہے۔ جانے  
 کون سی ڈگری لی ہے۔ ایم سی بی یا ایم ایس ڈی کیا کہہ  
 رہی تھی بتول۔“

”ایم ایس سی۔“ اماں کو سوچتے دیکھ کر انہوں نے  
 مشکل آسان کی۔

”ہاں ہاں وہی۔“ اماں خوش ہوئیں۔  
 ”مجھے تو عادت کی بھی ٹھیک لگی۔“

وہ خاموش ہی رہے  
 ”تصویر میں لے آئی ہوں۔“ اماں نے تکیے کے

نیچے سے ایک لفافہ برآمد کیا۔ ”تم دیکھ لو، اگر پسند آئے  
 تو میں کل جا کر بات کی کر آؤں، ورنہ بیٹا تمہاری

مرضی زور زبردستی تو میں کرنے سے رہی۔“  
 انہوں نے ہنسنے لگی۔

”ہاں! میں دیکھوں، میرا مطلب ہے کہ۔۔۔“  
 ”نہیں، نہیں لے جاؤ تم!“ اماں مسکرا دیں۔

”اطمینان سے دیکھ لو۔“  
 ”انتار ہوا گیا، ابھی بھی شرماتا ہے۔“ وہ جانے لگے

تو پیچھے سے انہوں نے اماں کی بڑبڑاہٹ سنی۔  
 ”کیا اماں؟“

”بیٹا! وہ رحمانہ کیسی لگی تمہیں؟“ اماں نے رُک  
 رُک کر پوچھا۔



”بہت خوب صورت ہے اماں!“ انہوں نے دانت

نکلے۔ ”خوب صورت؟“ اماں کو بیٹے کی دماغی حالت

منکوک لگی۔ ”کیا مذاق کر رہے ہو بیٹا؟“

”نہیں اماں!“ وہ حیران ہوئے۔ ”مذاق کیوں

اڑاؤں گا بھلا؟ مجھے تو خوب صورت ہی لگی اس لیے

کہہ رہا ہوں۔“

”اب دروغ گوئی سے تو پرہیز کرو!“ اماں برا مان

گئیں۔ ”ہاں انسان کا بچہ ہے۔ بس۔“

”جی وہ تو ہے۔“ انہوں نے سعادت مندی سے

ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔

”پھر ہاں کر دوں؟“ انہوں نے سوالیہ نظروں سے

انہیں دیکھا۔

خلیل احمد تھوڑا شرمائے پھر اماں کی گود میں سر دھک

کر لیٹ گئے۔

اماں مسکراتے ہوئے ان کے سر میں انگلیاں

پھیرنے لگیں۔ \*\*\*

اماں بات طے کر کے آئیں تو مفتی کے لڈو لے کر

وہ سیدھے افتخار کے ہاں پہنچے۔

”بھئی خلیل بہت بہت مبارک ہو!“ افتخار ان کا

دوست تھا خوشی سے کھل پڑا۔

”ہاں تصویر دیکھی ہے۔“ وہ مسکرائے۔  
 ”اچھا! ایسی ہے؟“ افتخار کو اشتیاق ہوا۔  
 ”بس! اچھی ہی ہے۔ کیا کہوں۔ تم خود دیکھ لینا!“  
 ”ہاں ہاں۔ دیکھیں گے ہی۔ بھئی ہماری فکر کی  
 ہونی چاہیے۔“ افتخار نے اندر آتی حمیدہ کو دیکھ کر  
 یا آواز بلند کرنا اور حمیدہ خسرے مسکرائی۔  
 ”بھابھی تو بہت اچھی ہیں یار!“ خلیل احمد  
 شرمندگی سے مسکرائے۔  
 ”جانے دیجیے خلیل بھائی! انہیں تو بس یونہی  
 عادت ہے۔“ حمیدہ نے بناوٹی شرم سے کہا۔  
 ”نہیں بھائی عادت کی کیا بات اچھی چیز کی تعریف  
 تو ہر بندہ کرتا ہے۔“ افتخار نے سر ہلایا۔  
 ”ہاں تو خلیل بھائی! کب لے جا رہے ہیں ہم  
 آپ کی بارات۔“ حمیدہ نے پوچھا۔  
 ”وہ تو اماں کو ہی خبر ہوگی۔“  
 ”لو بھئی۔ بارات جس کی جانی ہے اسے خبر ہی  
 نہیں اماں کو خبر ہوگی۔“ حمیدہ ہنسی۔ ”مجھے تو ترس آ رہا  
 ہے اس آنے والی پر۔ آپ تو ہمہ وقت اماں اماں کی  
 تسبیح پڑھا کر بس گے اور وہ جل جل کر خاک ہوگی۔“  
 ”بھئی جی۔ چائے کیا۔ باغ سے چل کر آئے گی۔“  
 افتخار کو اس کی ان بے سرو پا باتوں سے بچنے کا ایک  
 ہی طریقہ آتا تھا۔  
 ”ہاں ہاں۔ لینے جا رہی ہوں۔“ وہ انہی۔ ”آپ کو  
 تو بس مجھے مصروف رکھنے کا ہتھکنڈہ چاہیے۔“  
 ”تم مصروف ہی رہو تو اچھی ہو۔“ اس کے جانے  
 کے بعد افتخار بدبویا۔  
 پھر خلیل احمد کافی دیر تک اس مسئلے پر اس کے  
 ساتھ سر کھپاتے رہے۔



پھر خدا خدا کر کے وہ دن آئی گیا جس کا خلیل احمد کو  
 برسوں سے انتظار تھا۔ شہری شیر والی میں بلبوس سر پہ  
 ٹوپی جمائے وہ بڑی سرشاری سے لڑھکے اور پھر  
 رہے تھے۔ آج دوستوں کے درمیان ان کا سر بھی بلند

”بھابھی! ناراض ہو گئیں شاید۔ بس وہ اچانک ہی  
 اماں نے۔“

”یار۔ دفع کرو اس بے وقوف عورت کو۔“ افتخار  
 نے ہاتھ ملے۔ ”بس جو ہوا اچھا ہوا۔ اسے تو یونہی  
 عادت ہے گیس لڑانے کی۔ تم سناؤ دیکھا ہے اسے؟“



ہم سب کہہ کہہ کر تھک گئے۔ اب آپ ہی بچتے ہیں نا۔

”چھوڑو نا حمیدہ!“ افتخار زنج ہوا۔ ”ان کی مرضی جیسے چاہیں تصویریں بنوائیں“

”اچھا جی ہمیں کیا۔ اس نے کندھے اچکا کر افتخار کو گھورا۔ ”وہی دیکھیں گی ساری زندگی اپنی تصویریں۔ ہم تو بھلے کے لیے ہی کہہ رہے ہیں۔ دلہن بن کر چشمہ لگانا عجیب سا لگتا ہے۔ جو کر لگ رہی ہیں پوری۔“

”افوہ۔“ افتخار پریشان ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ”اچھا تم جا کر سارے بچے اٹھتے کرو۔ بس چلتے ہیں بہت رات ہو گئی ہے۔“

حمیدہ کی زبان کی دھار سے وہ بے چارہ اسی طرح عاجز رہا کرتا تھا۔

حمیدہ نے اسے گھورا اور مڑ کر کمرے سے نکل گئی۔ تھوڑی دیر بعد تمام دوست ایک ایک کر کے چلے گئے تو شکیل احمد نے ایک تھکن سے بھرپور انگڑائی لی اور وہیں تخت پر دونوں ہاتھوں کا تکیہ بنا کر لیٹ گئے۔ ”ارے بیٹا شکیل!“ اماں کچھ فکر مند سی اندر داخل ہوئیں۔

”جی اماں؟“ وہ اٹھ بیٹھے۔ ”بیٹا! دیکھو ذرا دلہن کے پاس جا کر بیٹھو، کچھ تسلی دے دے، بے چاری روئے جاتی ہے۔“

”کیوں اماں؟ کیوں رو رہی ہیں وہ؟“ وہ پریشان ہو گئے۔ ”بھئی وہ عورتیں اس سے چشمہ اتارنے کا کہہ رہی تھیں اور وہ راضی نہیں تھی شاید کسی کی کوئی بات دل کو لگ گئی ہو۔ تم جاؤ ڈھارس دے دے۔“

”جی میں؟“ ان کا دل اچانک سی گھبرانے لگا۔ ”ہاں ہاں جاؤ!“

”جی اچھا!“ وہ ڈرتے ڈرتے اٹھے اور دوسرے کمرے میں آ گئے۔

لال کپڑوں میں ملبوس رحمانہ بیگم واقعی رو رہی تھیں۔

ہو گیا تھا۔ پچھلے دو تین دن سے ان کے دوستوں نے جمع ہو کر سارے گھر کو سر پر اٹھا رکھا تھا۔ اور تو اور شکیل احمد نے خود ان کے درمیان لہک لہک کر ڈانس کیا تھا۔ افتخار کے پہلے اصرار اور پھر ڈانٹ پر وہ بڑا شرماتے لجاتے اٹھے تھے اور پھر افتخار کو ہی دوبارہ ڈانٹ کر انہیں واپس بٹھانا پڑا تھا۔

اماں بی کی الگ خوشیوں کا ٹھکانہ تھا۔ وہ شکیل احمد کی بلائیں لیتے نہ تھکتی تھیں اور آج تو ان کے پاؤں ہی زمین پر نہ ٹکتے تھے۔ گلابی سلکی جوڑے میں ملبوس وہ بڑے فخر سے خواتین میں براجمان اپنے بیٹے کی تعریفوں میں زمین اور آسمان کے قلابے ملا رہی تھیں۔ آخر کار شکیل احمد کی بارات بڑی شان سے گئی اور وہ رحمانہ بیگم کو دلہن بنا کر لے آئے۔ دلہن کو اماں بی اور شکیل احمد کے دوستوں کی بیگمات دوسرے کمرے میں لے گئیں۔ اور وہ فخر سے گردن اکڑائے اپنے دوستوں میں بیٹھ گئے گویا دنیا فتح کر کے آرہے ہوں ویسے دل ہی دل میں وہ خود کو سکندر اعظم سے کچھ کم نہیں سمجھ رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد ایک ایک کر کے بیگمات بھی وہیں آنے لگیں۔

”ہائے اللہ! میں مرجاؤں۔“ گھبرائی ہوئی اندر داخل ہونے والی خاتون حمیدہ تھیں۔

”آمین!“ افتخار زرب لب بڑبڑایا تھا۔ ”شکیل بھائی! بھابھی رحمانہ تو چشمہ لگاتی ہیں!“

”جی؟“ شکیل احمد کی مسکراہٹ غائب ہوئی! ”(پورے ہفتہ بھر بعد) ”جی بھابھی۔ مجھے علم ہے!“

”تو تو بھئی وہ تو اتارتی ہی نہیں ہیں۔ سب ان سے کہہ رہے ہیں کہ چشمہ اتار کر تصویریں بنوائیں مگر وہ راضی ہی نہیں ہوتیں بس روئے جا رہی ہیں۔“

”پھر؟“ وہ پریشان ہوئے۔ ”میں میں کیا کروں؟“

”تو آپ کہے نا ان سے۔“



”رے۔۔۔ جانے!“ انہوں نے زیر لب بڑبڑا کر

کہا۔ ”بھئی ہنی کیا بات ہو گئی؟“ بالآخر بڑا بے تکلف

بن کر پوچھا۔ ”کیا؟“ دلن بیگم نے بہت ترخ کر سرائیا اور کچھ دیر فکر کر کے یوں ان کو دیکھتی رہیں کہ وہ ہی شرما گئے۔

”کیا فرمایا آپ نے؟“ ”میں نے عرض کیا کہ... کیوں رو رہی ہو ہنی!“ وہ

تکلف اور بے تکلفی کے بیچ لٹکتے رہے۔ ”ہنی؟ دیکھیے صاحب! میرا نام رہخانہ ہے اور

مجھے اسی نام سے مخاطب کریں تو بہتر ہو گا۔ دو ٹوک بات کی گئی۔

”اچھا ٹھیک ہے!“ وہ ڈر گئے۔ ”کیوں رو رہی ہو رہخانہ؟“

”اپنی ماں کو اکیلا چھوڑ آئی ہوں، کیا روؤں بھی نہیں؟“

”بالکل روؤ، نہیں میرا مطلب ہے بالکل مت روؤ۔ دیکھو نا پہلے تو تم ایک تھیں۔ اب ہم دو ہو گئے

ہیں۔ ہم مل کر ان کی خدمت کریں گے۔ یہ لو پانی پی لو۔“

تائی پر رکھا گلاس اٹھا کر انہوں نے اس کو دیا، اس نے گلاس تھاما اور رُک رُک کر پانی پینے لگی۔ اتنی دیر

میں انہیں اس کا جائزہ لینے کا موقع مل گیا۔ ”بالکل وہی ہو ہو اپنی تصویر جیسی۔“ انہوں نے

سوچا۔ ”بھئی یہ کیا بات ہوئی۔ انسان اپنی تصویر سے یا تو کچھ اچھا ہوتا ہے یا کچھ برا، یہ کیا بات ہے کہ بالکل بھی

فرق نہ ہو، لگتا ہے کہ تصویر ہی بیٹھی ہے سامنے۔ عجیب سا لگ رہا ہے۔ حمیدہ بھابھی ٹھیک ہی کہتی تھیں

”کم از کم آج کے دن تو چشمہ اتار ہی دینا چاہیے تھا۔“

”یوں گھور کیا رہے ہیں؟“ ”جی! میں! میں سوچ رہا تھا کہ تمہاری ناک تھک

گئی ہوگی نا!“ ”ناک تھک گئی ہوگی؟“ اسے بے حد تعجب ہوا۔

”وہ کیوں؟“

”بھئی اس چشمہ سے۔۔۔ انسانی نام مقبول چشمہ ہے بس اتار داسے۔“ انہوں نے خود ہی بڑبڑا کر چشمہ اتارنا چاہا۔

”نہیں جی۔“ اس نے بری طرح سے انہیں جھڑکا۔

”میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ اس معاملے میں کوئی سمجھوتا نہیں ہو سکتا۔ میں حقیقت پسند لڑکی ہوں اور

ہاں لائٹ بند کرویں مجھے نیند آرہی ہے۔“

شکیل احمد چند لمحے بے بسی سے بیٹھے رہے۔ ”بڑی ہی کڑک دلن ہے بھئی!“ انہوں نے سوچا

اور اٹھ کر لائٹ بجھا دی اور باہر نکل گئے۔ اگلے کئی دن دعوتوں میں گزر گئے۔ شکیل احمد کا

حلقہ احباب کافی وسیع تھا، سو ہر روز اور کسی نہ کسی کے گھر دعوت ہوتی۔ بالآخر ایک دن رہخانہ بیگم کے صبر کا

پیمانہ لبریز ہو ہی گیا۔ ”ہنی! بھئی تیار نہیں ہوئیں تم؟“ وہ اندر داخل

ہوتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔ رہخانہ بیگم نے ایک نہایت کھلی نگاہ ان پر ڈالی۔

”میں نے کتنی بار سمجھایا ہے آپ کو کہ میرا نام رہخانہ ہے اور مجھے اسی نام سے مخاطب کریں۔“

”بھئی...“ وہ کڑبڑا گئے۔ ”کیا بھئی؟“ ترخ کر پوچھا۔

”میں کہہ رہا ہوں کہ ہنی کہہ کر بلانے میں کیا برائی ہے۔ اب دیکھو نا۔ ایسے پیار محبت سے بلانا اچھا لگتا

ہے نا!“ ”پیار، محبت؟“ ان کی تو تے جیسی آنکھیں پھیلیں۔

”حد کردی آپ نے شکیل احمد! اپنی عمر دیکھیے اور یہ باتیں دیکھیے۔ کوئی سن لے تو کیا سوچے؟ پیچ پیچ۔

کیسی ذہنیت ہے آپ کی؟“ ”عمر؟“ وہ بالکل بچھ گئے۔ ”ذہنیت...؟“

”میں کہہ رہا تھا کہ تیار نہیں ہوئیں ابھی تک۔“ مردہ دلی سے پوچھا۔

”میں عاجز آ چکی ہوں، ان روز روز کی دعوتوں

...



سے۔ یوں بھی میں ملنے ملانے کے معاملے میں بہت محتاط لڑتی ہوں۔ مجھے بالکل پسند نہیں ہے اس طرح منہ اٹھائے ہر ایرے غیرے سے ملنے کو پہنچ جانا۔“

”لیکن وہ ایرے غیرے نہیں میرے عزیز احباب ہیں۔“ انہوں نے دبا دبا احتجاج کیا۔ ”اور انہوں نے بڑے چاؤ سے بلایا ہے۔ ہم نہیں گئے تو کیا سوچیں گے وہ؟“

”سوچیں جوان کے دل میں آئے بے نیازی سے فرمایا گیا۔“ مجھے تو روز روز ان بھاری کپڑوں سے وحشت ہوتی ہے اور آپ کی اماں زبردستی دس من میک آپ پھمو کر بیس من زیورات لاد دیتی ہیں۔ مجھے نہیں پسند یہ سب کچھ۔“

”دیکھو ہنی۔ اوہو۔ رحمانہ؟“ اتنی ریکش کر لی تھی ہنی کہنے کی کہ زبان سے پھسل ہی جاتا تھا۔ ”آج کے دن اور تیار ہو جاؤ پھر کل سے معذرت کر لیا کریں گے، پلیز! میری خاطر۔“

”افوہ۔ پھر آپ نے یہ رومانٹک لہجہ بنا لیا۔ کتنی دفعہ سمجھاؤں آپ کو کہ اب یہ حرکتیں اچھی نہیں لگتیں۔“ وہ بے قرار ہو کر اٹھی اور الماری سے کپڑے نکالنے لگی۔

شکیل احمد بڑی لاچاری کی تصویر بنے اسے دیکھتے رہے۔ کتنا شوق تھا انہیں شادی کا کس قدر سوچا کرتے تھے وہ کہ یوں کریں گے اور یوں کہیں گے۔ لیکن رحمانہ بیگم! حقیقت پسندی کا یونٹی تھیں۔ سب سے بڑھ کر انہیں بات بات پر شکیل احمد کی عمر کا خیال مارے ڈالتا تھا۔ ذرا شکیل احمد رومانٹک ہوئے اور انہوں نے تڑ سے انہیں عمر کا طعنہ دے دیا۔ شکیل احمد کو بنی سنوری، لجاتی مسکراتی بیوی کی خواہش تھی اور رحمانہ بیگم کو ان تمام کاموں سے چڑ بلکہ نفرت تھی۔ اماں نے بڑے چاؤ سے بری کے جوڑے تیار کرائے تھے، لیکن انہوں نے پہننے سے قبل ہی سب گونا گونا کناری نوچ نوچ کر اتار ڈالا تھا۔ اماں چیختی ہی رہ گئیں کہ ”ہائے دلہن! آئے ہائے دلہن۔“ یہ کیا کر رہی ہو۔ ایک بار تو تن پر ڈال لو پھر جو چاہے سو کرنا۔“ لیکن

مجال ہے جو رحمانہ بیگم نے ٹانگ پر لکھی بھی بیٹھنے دی ہو۔

”دیکھیے اماں! یہ سب گونا گونا کناری مجھے پسند نہیں ہے! آپ میرا جینز دیکھ لیں کتنا سادہ ہے۔“

”لیکن دلہن! ایک مرتبہ مجھے پہن کر ہی دکھا دیتیں۔“ اماں نے حسرت سے کہا۔

”پہننا تو مجھے ہے اماں!“ اس نے بے زاری سے کہا۔ ”چاہے کیسے ہی پہنوں اور پھر میں کیا کوئی ماڈل ہوں جو یوں ان بناری کپڑوں کی ماڈلنگ کرتی پھروں۔“

اماں نے ٹھنڈی سانس بھر کر شکیل احمد کو دیکھا اور وہ نظریں چراگئے تھے۔ \*\*\*

پھر کتنے ہی دن گزر گئے اور شکیل احمد کے ارمان اندر ہی مر گئے۔ کیا بیوی ملی تھی ان کو قسمت سے یعنی ہر معاملے میں، ہر قسم کی رائے اور سوچ میں وہ ایک دوسرے کا قطعی الٹ تھے۔

شکیل احمد نے کب سے پیسے جوڑ جوڑ کر چند ہزار جمع کیے تھے کہ شادی کے بعد اپنی دلہن کے ہمراہ گھومنے پھرنے جائیں گے لیکن جوں ہی انہوں نے اس خواہش کا اظہار رحمانہ سے کیا، وہ بری طرح بھڑک اٹھی۔

”یعنی اب مجھے آپ کے ساتھ یہ ٹانگ بھی کرنا پڑے گا۔“

”ٹانگ؟“ وہ حسب معمول پریشان ہوئے۔ ”کون سا ٹانگ؟ میں تو ہنی مون کی بات کر رہا تھا۔“

”یا خدا!“ رحمانہ نے بہت پریشان ہو کر سر تھاما۔

”شکیل احمد! خدا را یہ ٹین! بھروالی خواہشات سے پیچھا چھڑائیے اپنا۔ آپ چالیس پینتالیس برس کے ایک میچور مرد ہیں ایسی باتیں کرتے بہت ہی بھدے لگتے ہیں۔“

شکیل احمد کا اور کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا اور مارے خفت کے آنکھوں میں پانی بھر آیا۔

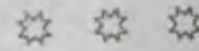
”چالیس پینتالیس!“ وہ ہلکی آواز میں بولے۔

”رحمانہ بیگم بڑی زیادتی کی تم نے تمہاری قسم اٹھ تو صرف چھتیس برس کا ہوں۔ تیس اور چھ۔ اماں سے



”چھ لو۔“  
 ”رہنے دیجیے۔“ اس نے بیزاری سے ہاتھ ہلایا۔  
 ”ہائیں تو پرفیکٹ ہوتی ہیں ایسے جھوٹ بولنے  
 میں ان کا بس چلے تو آپ کو پچیس برس کا بنا دیں اور  
 ہاں یہ اٹنے سیدھے خیالات نکال ڈالیں اپنے ذہن  
 سے اور آپ آفس کیوں نہیں جاتے؟“  
 ”اسی لیے تو چھٹی لی تھی میں نے آفس سے۔“ وہ  
 ہاوی سے بولے۔ ”کہ شادی کے بعد ذرا فراغت سے  
 گھومیں پھریں گے۔ لیکن تم۔۔۔“  
 ”بس تو ختم کیجیے یہ چھٹیاں اور آفس جوائن  
 کریں۔“  
 ”لیکن ہنی!“  
 ”پھر ہنی؟“ وہ پھر بگڑی۔ ”یا خدا کیسے شخص ہیں  
 آپ؟“

”تو اور کیا کہوں؟“ وہ شرمندہ ہوئے۔ ”پورا نام لینا  
 عجیب سا لگتا ہے۔“  
 ”بیگم کہہ لیا کریں۔ سوبر سالفظ ہے۔“  
 ”بیگم!“ ان کے نازک احساسات پر چوٹ پڑی  
 ”کتنا عجیب سالفظ ہے یہ بیگم بھی۔“ وہ سوچتے ہوئے  
 وہاں سے اٹھ گئے۔ ”ذہن میں بڑی موٹی تازی بھاری  
 بھر کی پان چباتی ہوئی عورت آجاتی ہے۔“  
 ”یار! بیگم سے تو رہنما ہی بہتر ہے۔“



اور پھر اگلے چند دنوں میں رہنما بیگم کے جوہر  
 پوری طرح کھل کر سامنے آ گئے۔ انہیں ”رومان“  
 شاعری، نزاکت، فطرت وغیرہ وغیرہ سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔  
 انہوں نے علم، کیمیا میں ایم ایس سی کی ڈگری حاصل  
 کر رکھی تھی اور سوائے اپنے مضمون کے انہیں کسی  
 شے سے دلچسپی نہ تھی۔ غالباً ”ان کی پہلی منگنی ٹوٹنے  
 اور پھر دوبارہ نہ جڑنے کا سبب بھی یہی تھا۔“

کچھ دنوں بعد اس نے اپنے جینز کے سلمان سے  
 ایک بڑا سا تھیلا برآمد کیا اور ڈھیر ساری سائنسی کتابوں  
 کو ترتیب سے شیاف میں سجایا۔ شیاف میں پہلے

کھلیل احمد کی خریدی ہوئی چند شاعری کی کتابیں اور کچھ  
 رومانی ناول رکھے تھے جنہیں رہنما بیگم نے  
 بے اعتنائی سے کھلیل احمد کی الماری کے اوپری حصے پر  
 پھینک دیا تھا۔ ”یہ فضول چیزیں پڑھتے رہے ہیں آپ!  
 ان ہی کا اثر ہے آپ پر۔“ اس نے کھلیل احمد کو جتا  
 بھی دیا تھا۔

اب دن رات وہ تھی اور اس کی کتابیں۔ کھانا  
 پکانے اور گھر کے دیگر کاموں سے بھی اسے کوئی خاص  
 دلچسپی تو نہ تھی البتہ کسی نہ کسی طرح سارے کام وہ پٹنا  
 ضرور لیتی تھی۔ اسے اس بات کا بھی دکھ تھا کہ اسے  
 اپنی پسند اور معیار کا شوہر دستیاب نہ ہو سکا تھا۔  
 ”کاش کھلیل احمد! آپ کچھ چھینچ ہوئے۔“ اکثر وہ  
 کہتی۔

”آپ کو معیاری کتاب کا شوق ہوتا اور آپ کی  
 ایک بڑی سی لائبریری ہوتی جہاں آفس سے آکر آپ  
 بیٹھا کرتے۔ میں اور آپ گھنٹوں تحصیل علم کے لیے  
 وہاں بیٹھتے اور بحث کرتے۔ لیکن افسوس ایک بی اے  
 پاس ٹکڑک ان باتوں کو کہاں سمجھ سکتا ہے۔ آپ کو تو  
 یہ بھی نہیں پتا کہ یہ دنیا معرض وجود میں کیسے آئی، یہ  
 سورج چاند، ستارے درحقیقت کیسے ہیں۔ ان میں  
 سے کون غیر ساکت ہے اور کون ساکت!“

کھلیل احمد خاموشی سے بیٹھے کھانا کھاتے رہتے اور  
 اس کی یہ خود کلامی سنتے رہتے۔ کبھی کبھار وہ فور جذبات  
 سے وہ پھر کوئی ایسی حرکت کر ڈالتے جس پر انہیں دنوں  
 تک وہ شرمندہ کرتی۔ مثلاً ”ایک دن بڑے اشتیاق  
 سے وہ اس کے لیے گجرے لے آئے اور اپنے ہاتھوں  
 سے پہنانے کی کوشش کی۔“

”لاحول ولا قوۃ۔ کیا فضول ہے یہ سب۔“ وہ کسی  
 کتاب میں مگن تھی، بری طرح تپ گئی۔  
 ”یہ فضول نہیں ہے رہنما!“ وہ کچھ ناراض  
 ہوئے۔

”پھول عورت کی خوب صورتی کو برہماتے ہیں۔“  
 ”بھاڑ میں جائے خوب صورتی۔ خوب صورتی ہو  
 گی تو بڑھے گی نا، کیا میں آئینہ نہیں دیکھتی۔“



”علم کا اپنی ذات سے آگاہی کا۔ کائنات کو سمجھنے کا۔“

”چھوڑو رہخانہ بیگم! جو عورت اپنے شوہر کو نہ سمجھ سکے وہ بھلا کسی اور بات کو کیا سمجھے گی۔“  
انہوں نے افسوس سے سر ہلا کر سوچا اور عہد کیا کہ آئندہ وہ اس کے لیے کوئی چیز نہیں لائیں گے۔



بتول خالہ اور اماں عمرے کے لیے جا رہی تھیں، دونوں اپنے اپنے فرائض سے فارغ ہو چکی تھیں اور اب اس ”فارغ البالی“ کا مکمل لطف اٹھا رہی تھیں، سو دونوں سیلیوں نے عمرو کی ادائیگی کا مشترکہ ارادہ کیا تھا۔

”اماں! آپ کے بغیر دل اداس ہو جائے گا۔“  
شکیل احمد ان کی گود میں سر رکھے لیٹے تھے، پاس ہی بتول خالہ بیٹھی رہخانہ کے سر میں تیل ڈال رہی تھیں، ڈرنہ اسے تو سر پر رکھی ہوئی روکھی گھاس سے بھی کوئی دلچسپی نہ تھی، جب سر کی خشکی بالوں کی طرح اس کے ارد گرد اڑنے لگتی تب اماں ہی زیر دستی پکڑ کر ایک من تیل اس کے بالوں میں ڈال دیا کرتی تھیں۔

”کیوں میرے چاند! اماں نے ان کے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔“ اب ماشاء اللہ تمہارا گھر آباد ہے، دل کیوں گھبرائے گا؟ خدا ہو کا دم سلامت رکھے، اب اسی سے دل لگاؤ اپنا، ماں پر کب تک تکیہ کرو گے میرا کیا ہے آج ہوں تو کل نہیں۔“

”ایسا تو نہ کہیں اماں! ان پر رقت طاری ہوئی۔“  
”اچھا چل اٹھ اب۔“ انہوں نے پیار سے گھر کر کرا نہیں اٹھایا۔ ”بس بچہ بنا رہتا ہے اور اتنے دن ہو گئے شادی کو، اتنا نہ ہوا کہ دلہن کو کہیں گھما ہی لائے۔“

شکیل احمد نے شاکی نگاہوں سے رہخانہ کو دیکھا۔  
”میں نے تو کتنا ہی کہا لیکن رہخانہ کو کسی قسم کا شوق ہی نہیں۔“

”ارے بیٹا تم اس کی باتوں پر کتنے مت دھرا کر۔“  
بتول خالہ نے جلدی کر دی۔ ”یہ تو پاگل ہے پاگل۔“

”تم بے وجہ کے کیلیکس میں مبتلا ہو رہی رہخانہ!“  
انہوں نے سمجھانا چاہا۔  
”آپ سے کس نے کہا کہ میں کیلیکس میں مبتلا ہوں۔“ وہ چڑ گئی۔ ”مجھے کسی بھی قسم کا کوئی کیلیکس نہیں ہے۔ میں بے حد حقیقت پسند لڑکی ہوں۔“  
”لڑکی؟“ وہ شاید پہلی مرتبہ چڑے اور سوچنے پر مجبور ہوئے۔ ”مجھے چالیس پینتالیس سال کا بنا کر خود کو کس دھڑلے سے لڑکی کہتی ہے۔“  
”اچھا ایسا کرو۔ کچھ دیر کو پن لو اور پھر یا ہر آنگن میں رکھے منکوں پر پلیٹو دینا۔“  
”منکوں پر؟“ وہ حیران ہوئی۔ ”کیوں انہیں کیا بیماری ہے؟“

”اوہو۔ اچھے لگتے ہیں اور بس۔“  
”منکے اچھے لگیں بھی تو کیا فرق پڑے گا؟“  
شکیل احمد رنج ہو کر باہر نکلے اور گھر سے باہر گلی میں پھینک دیے۔  
لیکن چونکہ فطرتاً ”سیدھے اور معصوم تھے“ اس لیے کچھ ہی دن بعد اس کے لیے ڈھیر ساری چوڑیاں لے آئے۔

”یہ کیا ہے؟“ ڈبے کو گھور کر اس نے پوچھا۔  
”چوڑیاں ہیں۔ دیکھو ذرا کتنی ساری ہیں اور سارے رنگوں میں، اچھی ہیں نا؟ اور تم پہنو گی تو اور اچھی لگیں گی۔ سارے گھر کی فضا گونج اٹھے گی ان کی چھن چھن سے۔“

”مجھے چوڑیوں کا کوئی شوق نہیں!“ سنجیدگی سے جواب ملا۔ ”نہ گھر کی فضا چھٹکانے کا۔ آپ اماں کو دے دیں۔“

”اماں کو؟“ وہ بھونچکے رہ گئے۔ ”یہ چوڑیاں؟ اماں پہنیں گی؟“

”تو کیا ہوا؟“ اس نے ابو چڑھائے۔ ”انہیں تو دیے بھی چمکیلے کپڑوں کا، میک اپ کا، زیورات کا بہت شوق ہے۔“

”تمہیں کس چیز کا شوق ہے؟“ انہوں نے چڑ کر پوچھا۔



دلہن!

”اف اماں! اب یہ دلہن دلہن کتنا چھوڑ دیں۔“  
 رحمانہ بیزار ہو کر وہاں سے اٹھ گئی۔  
 ”اتنا عجیب محسوس ہوتا ہے۔“

اماں بے چاری ٹکڑ ٹکڑ سے دیکھتی رہ گئیں۔ بتول  
 خالہ شرمندگی سے چھائیہ کترے لگیں اور شکیل احمد  
 نے ٹھنڈا سا اس لے کر دوبارہ اپنا سراں کی گود میں رکھ  
 دیا۔

اماں اور بتول خالہ چلی گئیں تو شکیل احمد کو گھر  
 کاٹنے کو دوڑنے لگا۔

رحمانہ پہلے تو اماں کا خیال کر کے کچھ بات وغیرہ کر  
 بھی لیتی تھی لیکن اب تو اس نے ان کو بالکل ہی  
 نظر انداز کر ڈالا تھا۔ انہوں نے ہر جتن کر ڈالا تھا کہ وہ  
 کچھ رام ہو جائے، ان کے ساتھ بنے بولے، باہر نکلے،  
 گھومے پھرے، لیکن اس نے شکیل احمد کی ہر کوشش  
 کو ان کی عمر کا طعنہ دے کر ناکام بنا ڈالا تھا اور شکیل احمد  
 غریب کہیں کے، اس طعنے پر دل مسوس کر رہ جایا  
 کرتے شادی سے پہلے انہیں آئینے وغیرہ سے کوئی  
 خاص لگاؤ نہ تھا۔ بس شیوہ بناتے وقت ہی دیکھتے تھے۔  
 لیکن اب وہ صبح شام بغور خود کو آئینے کی نظروں سے  
 کھوجا کرتے، کہیں کوئی جھری یا شکن ہو، ایک آدھ  
 دانت کم ہو یا بال بچ چھ سفید بال ایک ساتھ کہیں سے  
 جھلکے ہوں۔ لیکن ہمیشہ وہ خود کو مطمئن ہی کرتے۔  
 ”نہیں بھئی۔ ایسی تو کوئی نشانی نہیں بڑھاپے کی۔  
 بس ٹھیک ٹھاک ہی ہوں۔ لیکن یہ رحمانہ! وہ ٹھنڈی  
 آہ بھر کر رہ جاتے۔“

دن بھر یا تو نیوٹن اور آئن اسٹائن کے قوانین پر غور  
 کرتی رہتی یا پھر چپ چاپ چھوٹے موٹے کاموں میں  
 لگی رہتی۔ شکیل احمد اگر خود سے اسے مخاطب کرتے  
 بھی تو جواب میں عجب فلسفیانہ گفتگو سنتے مثلاً۔  
 ”دیکھو بیٹی! فضا کس قدر خوشگوار ہو رہی ہے؟“  
 ”آپ کو پتا ہے شکیل احمد! اونڈون کی تہہ تیزی  
 سے کم ہو رہی ہے۔“  
 ”کیا کم ہو رہی ہے؟“ وہ بات کا عجیب و غریب

شکیل احمد نے رحمانہ بیگم کی تیز نظروں سے نظر ملائے  
 بغیر شکایتوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ ”ہر وقت نہ جانے  
 کون سی موٹی موٹی کتابیں پڑھتی رہتی ہیں، میں کوئی  
 پیار بھری بات کروں بھی تو انہیں ناگوار گزرتی ہے۔“  
 بتول خالہ نے پریشانی سے رحمانہ کو کھورا اور  
 نگاہوں ہی نگاہوں میں کچھ سرزنش کی۔

”بیٹا اس کے دماغ پر تو خشکی چڑھ گئی ہے۔“ انہوں  
 نے بیٹی کی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ ”جب یہ  
 چھوٹی تھی تو اسے ٹالی فالتی ہو گیا تھا۔“  
 ”ٹالی فالتی نہیں امی! ٹالی فائیڈ ہو گیا تھا۔“ پڑھی  
 لکھی بیٹی کو ان کی بات ناگوار گزری۔

”ہاں ہاں وہی۔ تب ہی یہ چشمہ بھی لگ گیا تھا اس  
 کو۔ جب سے ایسی خشکی چڑھی ہے اسے کہ بس  
 کتاب کا کیرا بن کر رہ گئی۔“

”آف کس قدر بے کار دلیل ہے امی! رحمانہ کو  
 سخت الجھن ہوئی۔ ”ٹالی فائیڈ تو ایک بیماری ہے، ٹھیک  
 ہو گئی۔ کتابوں کا اس سے کیا تعلق؟“

”اوئی بیٹی! یہ تمہارے دماغ کی خشکی ہی تو ہے کہ دنیا  
 کے میلے میں تمہارا دل ہی نہیں لگتا۔“ اماں نے سہلی  
 کی بھرپور تائید کی۔ ”ورنہ یہ دن تو گھومنے پھرنے بننے  
 بولنے کے ہیں، ان دنوں میں کتابوں کا کیا کام۔ تم  
 جانتیں نہیں، ان ہی موڈی بیماریوں میں بلا میں چھپی  
 ہوئی ہیں جو ایک بار پکڑ لیں تو جان نہیں چھوڑتیں۔  
 میں کل ہی مولانا صاحب سے تعویذ لاؤں گی تمہارے  
 لیے۔“

”اف اماں کیا جا... بے تکی باتیں ہیں سب۔“ وہ  
 جاہلانہ کہتے کہتے رنگ گئی تھی۔ ”جب ہی تو تعلیم کی  
 ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ تعلیم سے ہی ہمارے  
 ملک کی عورتوں کی آنکھوں پر پڑے ہوئے یہ پردے  
 ہٹ سکتے ہیں۔“

”تو کیا ہم سب پاگل ہیں؟ بے وقوف اور جاہل ہیں؟“  
 اماں کو سخت برا لگا۔ ”ہم نے دنیا دیکھی ہے بی بی!  
 اور اتنا تو ہمارا تجربہ ہے جتنی تمہاری عمر بھی نہیں ہے۔  
 یہ سب دین سے دور رہنے کا نتیجہ ہے۔ تم نماز پڑھا کر



جواب سہا کر اچھبے سے پوچھتے۔

”بچ! رہنے دیں۔“ وہ بیزاری سے کہتی۔ ”کیا

سمجھاؤں آپ کو!“

”ہنی! تم اس قدر مختلف کیوں ہو؟“

”جلے۔ آج آپ کو اتنا پتا تو چل گیا کہ میں دوسروں

سے مختلف ہوں، اس لیے اب آپ میرے رویے کی

شکایت چھوڑ دیں۔ میں دوسری فضول قسم کی عورتوں

میں سے نہیں ہوں، مجھیں سوائے شوہر کے آگے

پچھے پھرنے کے کوئی دوسرا کام اگر ہو تو گالم گلوچ اور

چٹنا چلانا ہو اور وہ گاڈ! عجب مخلوق ہیں یہ عورتیں بھی۔“

وہ ہلکی سی جھرجھری لے کر کہتی اور شکیل احمد

بے چارگی سے اسے تکتے رہ جاتے۔

سو اس دھک کے ساتھ وہ ایک دن افتخار کی طرف چلے

آئے۔

”اوہو، اوہو، ہو!“ افتخار نے انہیں بھیج کر پر زور

استقبال کیا۔ ”آج یاروں کو خیال آئی گیا ہمارا۔“

”ایسی بات نہیں۔“ وہ پھکی مسکراہٹ چہرے پر

سجا کر بولے۔ ”خیال تو تمہارا روز ہی آتا ہے۔“

”مگر موقع آج ملا ہے۔“ افتخار نے ان کی بات

کالی۔ ”ظاہر ہے، بھئی ظاہر ہے۔ نئی ٹوبلی دھن بیگم

کے آگے یہ افتخار بے چارہ کیا اہمیت رکھتا ہے؟“

”چھوڑو یار!“ وہ دھکی سے بولے۔ ”کچھ اور بات

کرو۔“

”کیا بات ہے بھئی شکیل میاں!“ افتخار نے انہیں

بغور دیکھا۔ ”طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“

”ہاں ہاں۔“ وہ زبردستی ہنسنے۔ ”طبیعت کو کیا ہونا

ہے؟“

”لڑائی ہو گئی بھابھی سے؟ پراتنی جلدی!“

”دوستی ہی کب ہوئی تھی جو لڑائی ہو گئی!“ وہ سر جھکا

کر بولے۔

”کیا مطلب؟“

جواب میں انہوں نے ساری داستان زلیخا سنا ڈالی۔

”افتخار! وہ بیوی نہیں بس ایک سائنسی ایجاو ہے یا

اخبار ہے، خبروں سے بھرا ہوا۔ سیاسی خبریں۔ مسئلے

میں سے بھرا ہوا اخبار۔“

”لیکن شکیل میاں! اخبار میں تو اسپورٹس کا صفحہ

بھی ہوتا ہے، فلم کا بھی اور۔ اور آکا کا روزنامی خبریں

بھی۔“

”وہ ایک ایسا بور اخبار ہے جس میں یہ آکا کا خبریں

بھی نہیں ہیں۔“ انہوں نے افسردگی سے بتایا۔

”اچھا!“ افتخار کو تعجب ہوا۔

”ہاں افتخار! میں نے ہر کوشش کر ڈالی اسے ٹھیک

کرنے کی۔ کیا کیا جتن نہ آزمائے پر سب بے سود۔

میں اس کے لیے گھر لے لاتا ہوں تو وہ انہیں باندھنا تو

کیا دیکھنا تک گوارا نہیں کرتی، چوڑیاں لاؤں تو کہتی

ہے اہل کو دے دیں، اب تم سوچو، اہل اور رنگین

چوڑیاں، لا حول ولاقوة۔ فلم کے ٹکٹ لایا تو بولی میرے

سر میں درد ہے کسی دوست کو لے جائیں۔ چشمہ

انار نے بروہ تیار نہیں حالانکہ میں نے اسے یس بنا

کر دیئے تھی پیشکش بھی کی، لیکن بقول اس کے کہ وہ

ایک حقیقت پسند لڑکی ہے اگر نظر کمزور ہے تو دنیا سے

چھپانے کی کیا ضرورت ہے۔ میں اسے خوب صورت

شعر سنانے کی کوشش کروں تو وہ مجھے باگل اور کھسکا ہوا

قرار دے کر جواب میں یہ بتانے لگتی ہے کہ شیر اور

انسان میں کیا کیا باتیں مشترک ہیں۔ وہ خود کو لڑکی اور

مجھے بوڑھا بتلاتی ہے۔ اسے اپنی پرہیزی پر ناز ہے اور

میرے ایک ادنیٰ کٹر گھونے پر شرمندگی۔ وہ رو دینے

کو ہو گئے۔

”افسوس۔“ افتخار نے سر ملایا۔ ”عجب خاتون

ہیں۔“

”السلام علیکم شکیل بھائی!“ ہاتھ میں چائے کی

ٹری اٹھائے حمیدہ اندر داخل ہوئی تو بڑی سرری

مسکراہٹ اس کے لبوں پر تھی۔ ”رہجانہ بھابھی کو

نہیں لائے یہ کیا بات ہوئی؟“

”وہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔“ انہوں نے

چہرے کو بٹاش بنانے کی کوشش کی۔

”اچھا! طبیعت تو آپ کی بھی بنا ساز لگتی ہے۔“ اس

نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ”کیا بات ہے اتنے افسردہ



کیوں ہیں؟

”نہیں، نہیں تو۔“ وہ بے ساختہ ہی ہنسنے لگے۔  
حمیدہ وہیں بیٹھ گئی اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔ وہ ہوں ہاں میں جواب دیتے رہے اور افتخار گہری سوچوں میں ڈوبا رہا۔

”بھئی انی پ۔“ حمیدہ نے بڑے لاڈ سے افتخار کو مخاطب کیا۔ ”دیکھیے، آپ کے دوست کتنے اداس لگ رہے ہیں۔ شاید یہ رحمانہ بھابی کی غیر موجودگی کا نتیجہ ہے اور آپ بھی خاموش بیٹھے ہیں کوئی لطیفہ چٹکا ہی سنائیں۔“

”مجھے کہاں چٹکے، لطیفے آتے ہیں۔“ اس نے جان چھڑانے کو چائے کی پیالی اٹھائی۔

”چلیے میں ہی سنائی ہوں ایک لطیفہ! غور سے سنئے گا شکیل بھائی آج ہی پڑھا ہے۔ تو ایک شوہر نے بڑے غصے کے عالم میں اپنی بیوی سے کہا۔ یہ چائے بنائی ہے؟ ایسی ہوتی ہے چائے؟ ساری چینی نیچے بیٹھی ہے اور چیونٹیاں اوپر تیر رہی ہیں۔“

”تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟“ پڑھی لکھی بیوی غصے سے بولی۔

”یہ تو سائنسی اصول ہے کہ بھاری چیز بیٹھ جاتی ہے اور ہلکی چیز اوپر تیرنے لگتی ہے۔“

لطیفہ سنا کر وہ خود ہی زور سے ہنس دی۔ شکیل احمد خفت سے بغلیں جھانکنے لگے۔ حمیدہ کو یقیناً ”چھپ کر باتیں سننے کی عادت بھی تھی۔ اور ان کی داستان سے مکمل حظ اٹھا کر وہ انہیں چھیڑ رہی تھی۔

”ہونہہ! یہ بھی کوئی لطیفہ ہے۔“ افتخار نے شرمندگی سے سر جھٹکا۔

”تو اور کیا ہے؟“ اس نے افتخار کو گھورا۔ ”کوئی رونے والی بات بھی نہیں جو آپ یوں منہ بنا کر بیٹھ گئے اور سنائیں شکیل بھائی! وہ دوبارہ ان کی جانب متوجہ ہو گئی۔ ”رحمانہ بھابی بھی راضی ہوئیں چشمہ اتارنے پر۔“

”نہیں، ابھی بھی لگاتی ہے۔“ وہ آہستگی سے بولے۔

”کمال ہے عجیب عورت ہیں۔“ وہ بڑبڑائی۔

”انہیں کوئی شوق ہی نہیں ہے اچھا نظر آنے کا؟“

”کیا معلوم؟“

”اب دیکھیے ناکتنی جھائیاں ہیں ان کے چہرے پر۔ انہیں شاید اس کی بھی پروا نہ ہو۔“

”کیا ہیں؟“ وہ چونکے۔

”جھائیاں، نشانات، کتنے بد نما معلوم ہوتے ہیں۔“

”اچھا۔“ رحمانہ کی جگہ وہ شرمندہ ہوئے۔ ”پھر کیا کیا جائے ان کے لیے؟“

”مجھے ایک اچھی سی کریم کا نام معلوم ہے۔ مگر رحمانہ بھابی استعمال بھی کر سکتا!۔“

”نہیں نہیں بھابی! آپ مجھے لکھ دیں۔ میں کہوں گا اسے استعمال کرنے کو۔“

”جی اچھا۔ جاتے وقت لکھوا لے جائیے گا۔“ وہ مسکرا کر بولی۔

پھر چلتے وقت انہوں نے واقعی کریم کا نام لکھوایا اور راستے میں آتے ہوئے میڈیکل اسٹور سے خرید کر گھر لے آئے۔

”بھئی، ہنی! بوجھو تو کیا آئے ہیں تمہارے لیے۔“

بڑے خوش خوش وہ اندر داخل ہوئے۔

”پھر کچھ لے آئے! وہ بڑبڑائی۔“ اب کیا اٹھا لائے؟“

”دیکھو ذرا۔“ انہوں نے کریم اسے تھمائی۔ ”بھابی کہتی تھیں کچھ دن کے استعمال سے فرق پڑے گا۔“

”کس سلسلے میں؟“ اس نے بڑی تیکھی نگاہ اٹھائی۔

”یہ جو پرچھائیاں ہیں نا تمہارے چہرے پر سب مٹ جائیں گی۔“ انہوں نے دانت دکا لے۔

”یہ آگہی کی پرچھائیاں ہیں شکیل احمد!“ اس نے کریم ڈرنگ ٹیبل پر ڈال دی۔ ”علم سے پیدا ہوتی ہیں اب کیا جانیں ان کی قدر۔“

”علم کا ان داغوں سے کیا تعلق؟“ وہ پریشان ہوئے۔

”کون سے داغ؟ اوہ اچھا۔ تو یہ بات ہے مجھے ان داغوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ اس نے کندھے



اچکائے۔ ”یہ کریم آپ استعمال کر لیں۔“  
شکیل احمد بیچ و باب کھا کر رہ گئے۔ اسی وقت  
دروازہ بجا اور وہ ایک زخمی نگاہ اس پر ڈال کر دروازے  
کی جانب بڑھ گئے۔

”السلام وعلیکم!“ باہر جو لڑکی کھڑی مسکرا کر ان سے  
مخاطب ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ چند لمحوں پیشتر والی  
جھلاہٹ اور کوفت کو بھول گئے۔  
”وعلیکم السلام!“ بڑی گرم جوشی سے جواب دیا۔  
”رحمانہ باجی ہیں؟ مجھے ان سے ملنا ہے۔ میں کرن  
ہوں ان کی۔“

”اوہ اچھا اچھا۔ باہر کیوں کھڑی ہیں آپ آئیے  
نا!“ انہوں نے لپک کر اس کا ہیک اٹھالیا اور اسے اندر  
لے آئے۔

”رحمانہ بھی دیکھو تو کون آیا ہے۔ تمہاری کرن  
آئی ہیں بھی۔“  
رحمانہ اندر سے نکلی تو وہ لڑکی چیخ مار کر اس سے  
لیٹ گئی۔

”ہائے رحمانہ باجی! مبارک ہو بہت بہت، آخر یہاں  
ہی لیا نا گھر۔“  
”آؤ بیٹھو!“ رحمانہ نے اس گرم جوشی کا کوئی خاص  
جواب نہ دیا۔ ”کب آئیں؟“

”ابھی تو آئی ہوں۔ پہلے آپ کے میکے گئی تھی  
لیکن بتول خالہ تھیں نہیں۔ تالا بڑا تھا دروازے پر  
وہیں پڑوس سے ایک لڑکے کو لیا ساتھ، مجھے کیا خبر تھی  
آپ کی سسرال کہاں ہے؟ شادی میں کہاں آپائی تھی  
میں۔“

”کافی دن بعد آئی ہو؟“ رحمانہ نے اس کے ہیک پر  
نگاہ ڈالی۔

”جی ہاں، میرا سفر جو ہو گیا ہے یہاں۔ اب کچھ  
عرصہ آپ کے پاس رہوں گی پھر ہاسٹل وغیرہ شفٹ ہو  
جاؤں گی۔ یہ دو لہا بھائی ہیں نا!“ اس نے ایک شریر نگاہ  
شکیل احمد پر ڈالی۔

”ہوں۔“ رحمانہ نے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔  
”میں کھانے وغیرہ کا بندوبست کر لوں تم ان سے

باتیں کرو۔“  
”میرا نام شمسہ ہے اور آپ کا نام؟“ جوتے اتار کر  
اس نے بے تکلفی سے پاؤں اوٹنے کیے۔  
”شکیل احمد!“ وہ مسکرائے اور کرسی کھسکا کر اس  
کے قریب بیٹھ گئے۔

”میں اسکول میں پڑھاتی ہوں اور آپ؟“  
”میں میں بھی ایک آفس میں ملازم ہوں۔“  
”ہماری باجی کیسی لگیں آپ کو؟“ اس نے  
شرارت سے آنکھیں کھمائیں۔

”جی؟ اچھی ہیں۔“ انہوں نے سر جھکا لیا۔  
”بالکل نہیں۔“ وہ مسکرائی۔  
”جی؟“ وہ حیران ہوئے۔

”بہت اچھی ہیں۔“ وہ ہنس دی۔ ”صرف اچھی  
سے کام نہیں چلے گا دو لہا بھائی!“  
”جی ہاں۔“ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی ہنسی میں  
شریک ہو گئے۔

اور پھر شمسہ کے آجانے سے شکیل احمد کی زندگی  
میں جیسے انقلاب آگیا۔ وہ ایک بے حد زندہ دل، ہنس  
کھ اور زندگی سے بھرپور لڑکی تھی۔ ہنسی ہر وقت اس  
کے لبوں سے شفاف جھرنوں کی طرح پھوٹی رہتی  
تھی۔ صبح اسے اسکول جانا ہوتا تھا، اس لیے وہ شکیل  
احمد کے ساتھ ہی گھر سے نکلتی تھی۔ واپسی پر بھی  
دونوں ایک ساتھ لوٹتے تھے۔ بانی کا سارا دن وہ مسلسل  
بیڑ پڑھتی رہتی۔ رحمانہ بیگم تو اسی بے اعتنائی سے  
ہوں ہاں کرتی رہتیں۔ جبکہ شکیل احمد اس کے ساتھ  
جیسے زیادہ بولنے کا مقابلہ شروع کر دیتے۔ وہ تمام  
فرمائشیں جو شکیل احمد رحمانہ کی زبان سے سننے کے  
مسمیٰ تھے اب وہ ان سے کیا کرتی۔

”شکیل بھائی! اس وقت تو بریانی کھانے کا موڈ ہے  
اور رحمانہ باجی نے بنائی ہے مسور کی دال۔ اب بتائیں  
بھلا دال اور بریانی کا کیا مقابلہ؟“

”میں ابھی لے آتا ہوں بریانی۔“ وہ جھٹ اٹھ  
کھڑے ہوتے۔

کبھی بیٹھے بیٹھے پان کا بھوت سوار ہو



جاتا۔ شکیل احمد فوراً جن کی طرح حاضر۔  
 ”شکیل بھائی! دیکھیں ناکنتی اچھی فلم لگی ہے  
 کپیری میں۔ آج تو چھٹی بھی ہے اور موسم بھی اچھا  
 ہے کیا خیال ہے رحمانہ باجی!“  
 ”ہوں؟“ رحمانہ جانے کس خیال میں تھی۔ ”کیا  
 کہا؟“

”میں کہہ رہی ہوں آج سینما چلتے ہیں فلم دیکھنے۔  
 کیوں شکیل بھائی؟“  
 ”ٹکٹ لے آؤں؟“ وہ جھٹ تیار۔

”اوں ہوں۔ اسی وقت لے لیں گے۔ تیار ہو  
 جائیں رحمانہ باجی!“  
 ”نہ بھی۔ یہ فضول شوق میں نے نہیں پالے۔ تم  
 جاؤ اپنے بھائی کے ساتھ اگر موڈ ہے تو“ شکیل احمد نے  
 مایوسی سے شمسہ کو دیکھا۔

”تیار ہو جاؤ شکیل بھائی؟“ اس کے جملے نے  
 انہیں جیسے نئی زندگی دے دی۔

”ہاں ہاں بالکل۔“ وہ فوراً ”اٹھ کھڑے ہوئے۔  
 ”واپسی میں تمہیں چکن سوپ پلاؤں گا“ دوست قسم  
 کا۔“

”ہائے جی؟“ وہ چیخ مار کرتا رہا ہونے لگا۔  
 اور پھر اس کے ساتھ فلم دیکھتے ہوئے اور سوپ  
 پیتے ہوئے، میٹھا پان چباتے ہوئے، شکیل احمد جیسے  
 ایک بالکل نئی دنیا میں پہنچ گئے۔

انہیں اسی کی تو تلاش تھی۔ جانے کب سے کتنے  
 سالوں سے وہ اسی کو کھوج رہے تھے اور وہ جیسے انعام  
 بن کر خود ان تک آپہنچی تھی۔



”رحمانہ! ابھی ناشتہ لا دو۔ دیر ہو رہی ہے۔“ انہوں  
 نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔

”شکیل بھائی! میں بھی آرہی ہوں۔“ چٹیا کے  
 آخری سرے پر ربرینڈ لگاتی ہوئی شمسہ ایک سے  
 دوسرے کمرے میں جاتے ہوئے بولی۔ ”کیس چھوڑ  
 نہ جائے گا مجھے۔“

”ہاں ہاں جلدی آجاؤ۔ ناشتا بھی کرلو۔“  
 رحمانہ نے ناشتا ان کے آگے رکھتے ہوئے غور  
 سے انہیں دیکھا اور وہیں کرسی گھسیٹ کر دھوپ میں  
 بیٹھ گئی۔

”ہاں بھی رحمانہ باجی!“ شمسہ آکر شکیل احمد کے  
 برابر بیٹھی اور انڈے کی پلیٹ اپنے آگے گھسیٹ کر  
 شرارت سے رحمانہ سے مخاطب ہوئی۔ ”سورج کی  
 گرمی سے ہم کون سا وٹامن حاصل کرتے ہیں؟  
 وٹامن ڈی؟“

رحمانہ نے گردن موڑ کر اسے دیکھا جیسے اندازہ لگا  
 رہی ہو کہ وہ واقعی سنجیدہ ہے یا اس کا مذاق اڑا رہی  
 ہے۔

”وٹامن ڈی۔“ اس نے مسات سے کہہ کر دوبارہ  
 گردن موڑ لی۔

شمسہ زور سے ہنس دی۔ شکیل احمد نے خوش ہو کر  
 اس کا بھرپور ساتھ دیا۔

”رحمانہ باجی! اندر آجائیں۔ کہیں وٹامن ڈی کے  
 چکر میں کینسر کے جراثیم نہ مل جائیں، جانتی نہیں زیادہ  
 دیر دھوپ میں بیٹھنے کا نتیجہ۔“ شمسہ کچھ دیر بعد پھر  
 بولی۔

رحمانہ اٹھی اور ان دونوں کی جانب دیکھے بغیر سڑ پڑ  
 کرتی کچن کی طرف چلی گئی۔

”بھئی شمسہ! تم بولتی بہت اچھا ہو۔“  
 ”اللہ شکیل بھائی! آپ مجھے شمی کہہ لیا کریں۔  
 مجھے اپنا نام بڑا عجیب سا لگتا ہے۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔ تمہیں پسند ہے تو شمی ہی  
 کہوں گا۔ اب چلیں؟“

”جی!“ وہ ہاتھ صاف کرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔  
 ”شکیل احمد!“ سویٹر بنتی رحمانہ اچانک ان سے  
 مخاطب ہوئی۔

”ہوں، کو۔“  
 ”آپ جانتے ہیں انسان خوابوں میں کیا دیکھتا ہے؟“

”کیا دیکھتا ہے بھلا؟“



”وہی جو اس کے لاشعور میں ہوتا ہے۔ عموماً“  
 ناتمام خواہشات۔  
 ”اچھا پھر؟“

”رات آپ نیند میں شمی شمی کر رہے تھے۔“  
 ”اچھا؟ واقعی۔“ وہ ہنس دیے۔ ”بڑی ہی اچھی لڑکی ہے یہ شمی! دل موہ لینے والی۔“ رحمانہ بیگم نے ایک گہرا سانس لے کر انہیں دیکھا۔  
 ”آپ کا دل موہ لیا ہے کیا؟“

”شکیل بھائی! شکیل بھائی!“ اس سے پہلے کہ وہ کچھ جواب دیتے شمسہ انہیں پکارتی ہوئی چلی آئی۔  
 ”آؤ، آؤ شمی! بیٹھو۔ ابھی ہم تمہارا ہی ذکر کر رہے تھے۔“

”اچھا کن الفاظ میں بھلا؟“ وہ شرارت سے ہنسی۔  
 ”اچھے الفاظ میں۔“ وہ بھی ہنس دیے۔  
 ”شکیل بھائی! میں کہہ رہی تھی چاندنی رات ہے۔ گھومنے چلیں کیس؟“

”تمہارا دل چاہ رہا ہے؟“  
 ”بے حد۔“ اس نے جذب سے آنکھیں بند کیں۔

”تو بس چلو پھر قریبی پارک کا چکر لگا آتے ہیں۔“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔  
 ”رحمانہ باجی! چلیں گی؟“ جاتے جاتے مڑ کر شمسہ نے پوچھا۔

”نہیں!“ بڑا کڑک جواب ملا۔ وہ ہولے سے مسکرائی اور دونوں باہر نکل گئے۔  
 پھر جانے کتنی دیر بیت گئی۔ شمسہ کی ہمراہی میں گھومتے گھومتے ان کو وقت کا پتا ہی نہ چلا۔ گھڑی پر نظر دوڑائی تو بتا چلا رات کے بارہ بج گئے ہیں۔

وہ دونوں گھرواپس پہنچے تو دروازہ کھلا ہوا ہی تھا۔ منٹے مسکراتے دونوں اندر داخل ہوئے صحن کے بیچ پہنچ کر شکیل احمد رک گئے۔

”شمی! تم نے آکر میری زندگی بدل ڈالی ہے۔ تمہارے آنے سے جیسے میری زندگی کے تپتے صحرا میں ہماری آگنی ہے۔“

”تو آپ اس ہمارا کو امر کر لیں نا! ہمیشہ کے لیے۔“ وہ مسکرائی۔

”ٹھہر جا کہہنی میں بتاتی ہوں تجھے؟“ بوگن ویلیا کی بیل کے جھاڑ کے پیچھے سے رحمانہ بیگم برآمد ہوئیں اور شمسہ کی چٹپٹا کپڑی ”میرے ہی گھر میں ڈاکہ ڈالنے چلی آئی۔ مجھے ہی برباد کر رہی ہے ڈاکن۔ منحوس عورت!“

”باجی! باجی! میری بات تو سنیں۔“ شمسہ نے بیل چھڑانے کی کوشش کی۔ لیکن رحمانہ بیگم پر بھوت سوار تھا۔ انہوں نے اسے وہ کہنے دیے کہ محلے کے گھروں کے دروازے کھلنے کی آوازیں آنے لگیں۔ شکیل احمد کی تو حیرانی سے آنکھیں پھٹ گئیں۔ یہ رحمانہ بیگم تھیں۔ عام عورتوں سے مختلف نہیں تھیں۔ یہ تو بالکل ایک عام عورت ہی ہیں۔ خوشی سے ان کی باچھیں چرنے لگیں۔

”نکل جا۔ ابھی نکل جا میرے گھر سے۔“ انہوں نے خود جا کر اس کا بیک لانا تھمایا اسے۔

”چلو شمسہ! میں چھوڑ آتا ہوں تمہیں ہاسٹل۔“ شکیل احمد آگے بڑھے۔

”رہنے دیں جی۔ خود چلی جائے گی۔“ حکمہ لہجہ تھا۔

”اس وقت آگلی لڑکی کہاں جائے گی؟“ انہوں نے التجائے لہجے میں کہا اور جلدی سے باہر نکل آئے۔ شمسہ کئی میں کھڑی پھولے سانپوں کے ساتھ بال درست کر رہی تھی۔

”کیسا رہا شکیل بھائی؟“ اس نے ہانپتے ہوئے پوچھا۔

”دنڈر فل۔ لیکن شمی! تمہارے بال بڑے زور سے نوچے اس نے۔“ انہیں افسوس ہوا۔

”کوئی بات نہیں۔“ اس نے اطمینان سے کہا۔

”اب دعا کریں! واپسی میں آپ کے بال نہ فوج ڈالیں۔“

”ایسا بھی کوئی اندیشہ ہے کیا؟“ وہ ڈرے۔  
 ”میرے خیال میں تو نہیں۔“ اس نے کندھے



اچکائے۔ فکیل احمد نے اس کا بیک اٹھایا اور ساتھ ساتھ چلنے لگے۔  
 ”جی! اب رہخانہ ٹھیک ہو جائے گی نا؟“ انہوں نے امید سے پوچھا۔  
 ”ہنڈرڈ سینٹ!“ اس نے یقین سے کہا۔  
 ”برف پکھل چکی ہے۔ اب دیکھیے گا کیسا سدھرتی ہیں۔“  
 ”تم تو بڑی عقل مند ہو ٹھی!“ انہوں نے تحسین سے اسے دیکھا۔

”آداب عرض۔“ وہ ہنسی۔ ”کالج لائف میں سائنکالوجی میرا پسندیدہ مضمون تھا۔ رقابت کی بہ نسبت کوئی دوسرا جذبہ عورت کے عورت پن کو اس تیزی سے نہیں ابھار سکتا۔ یہ میرا مشاہدہ بھی ہے اور تجربہ بھی اور ہاں کچھ دن بعد رہخانہ باجی کو ساری بات بتا کر میری پوزیشن صاف کر دیجیے گا!“  
 ”بے فکر رہو۔ میں اس کا دل بالکل صاف کروں گا۔ کچھ دن بعد دیکھنا وہ تمہیں خود لینے آئے گی۔ آخر واحد سالی ہو میری۔“

وہ دونوں ہی ہنسنے لگے۔ \* \* \*

رہخانہ سڑ پیڑ کرتی۔ سارے کمرے میں پھر رہی تھی۔ چیزوں کی اٹھا خ جاری تھی۔ فکیل احمد نے کتاب سے ذرا سا سر نکال کر دیکھا۔ اس نے چشمہ اتار کر ڈرنگ ٹیبل پر پٹخا اور آنسو پونچھ کر غور سے اپنی صورت دیکھی۔

پھر اس نے دھڑ سے دراز کھولی اور وہی کریم نکالی جو فکیل احمد نے لا کر دی تھی۔

”بھئی کریم لگانے کی شرط ہے کہ آنسو نہ بہیں ورنہ کیمیکل ری ایکشن ہو جاتا ہے“ کریم اور آنسوؤں کے ملاپ سے۔ ”وہ بڑی شوخی سے بولے۔“

”آپ بات نہ کریں مجھ سے۔“ ترخ کر جواب دیا۔

فکیل احمد اٹھ کر اس کے پاس گئے اور جیب سے رومال نکال کر اس کے آنسو صاف کیے۔

”آپ مرد لوگ صرف خوب صورتی کے پجاری

ہوتے ہیں۔ ذہین عورت کو چڑھتا لیتے ہیں اپنی۔“  
 ”ایسی تو کوئی بات نہیں۔ ہاں ذہانت کے ساتھ خوب صورتی بھی ہو تو کیا برائی ہے؟“  
 ”بس رہنے دیں۔“ وہ فکیل سے بولی۔ ”کیا ہے شمشہ میں؟ صرف شکل ہی ہے نا؟“  
 ”وہ ایک اچھی لڑکی ہے۔ میری بہنوں جیسی ہے اور بس۔“  
 ”اور وہ گھومنا پھرنا؟“ اس نے شاکی نظروں سے دیکھا۔

”ارے تو کیا بہن کو گھما پھرا نہیں سکتے اور تم کون سا گھومنے جاتی تھیں میرے ساتھ۔“  
 ”اب چلا کروں گی۔ ورنہ آپ ضرور ہاتھ سے نکل جائیں گے۔ اسی ٹھیک کہتی ہیں، مردوں کو لگام ڈال کر رکھنا چاہیے۔ غلطی میری ہی تھی۔“ وہ پھر رونے لگی۔

”اچھا بس اب رونا دھونا بند کرو۔ ان تو نا چشم میرا مطلب ہے کہ۔۔۔“

وہ ڈر رہے تھے کہ منہ سے کیا نکل گیا۔ لیکن رہخانہ ہنس دی۔

”واقف ہوں اپنی تمام خامیوں اور خوبیوں سے۔“  
 ”ایسی کوئی بات نہیں۔“ انہوں نے تسلی دی۔  
 ”تمہاری آنکھوں پر تو شعر لکھے جاسکتے ہیں۔ ایک شعر میں نے بھی لکھا ہے سنو۔“

”رہنے دیں جی۔“ وہ فوراً وہاں سے ہٹ گئی۔  
 ”اپنی عمر دیکھیں اور شعر سنانا دیکھیں۔“ فکیل احمد ہنس دیے۔ زبردستی نہیں۔ بے ساختہ ہی۔

